

سیلابِ بلا

نعیم صدیقی

ہمارے کشتی سیلابِ عذاب میں ڈانواں ڈول ہوتی ہوئی گزر رہی ہے۔ خطرہ غرقابی کسی مگر مجھ کے ذہن یا کسی مجنور کے آنکھ کی طرح اس کشتی کو ہدف بنائے ہوئے ہے۔

شمالی جانب بیرونی دشمنوں کی بباریاں، راولپنڈی اسلام آباد میں اوجھڑی ڈپو کی تباہی، پنجاب میں سیلاب کی تندہروں کا انسانی زندگیوں اور اسبابِ تمدن کو جھاڑو کی طرح بہاے جانا، سندھ اور کراچی میں نقاب پوش اور بے نقاب تباہ کاروں کی ایسی پورشیں کہ انسانوں اور جائیدادوں اور ذرائع و وسائل کی مکمل غارت گرمی و غیر ملکی مداخلت کاروں کا کٹی اطراف سے ٹوٹ پڑنا، ملک بھر میں مہلک سازشوں کے جالوں کا پھیلاؤ، چھ چھ ماہ کے بچوں کی خونریزی، مادیت اور نسائیت اور بزرگی کی بے توقیری، ادھر سیاست کے جوڑ توڑ، قانونی اور غیر قانونی چالباریاں، کہیں عہداری دین کے اندر کھسے کھسے اور کہیں لادینیت کے دھماکے، غیر مسلم اقلیتوں کا مسلم لادینیت پسندوں کے پیچھے پاکستان کے استحکام اور ظہور اسلام کے ”خطرے“ کے خلاف صف آرا ہو جانا، گرائی اشیاء، خیانت کاری کے سانپوں اور بچھوؤں کا زور اس عالم میں تعیش پسندیاں، اسی ماحول میں ذرائع ابلاغ کے اکھاڑوں میں دروغ کا فروغ اور کردار کشی اور مذاتہ ثقافت کی عشوہ فروشیاں — اور دودھ سٹاپن گلیشیر کی ۴۰ ہزار فٹ بلند چوکیوں پر قلت افراد، قلت رسد اور قلت وسائل کے ساتھ جان کی بازی لگانے والے قابلِ فخر فوجانہ جہ

اے جس وقت ایک خاص فضا میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، اس کے تقریباً ایک مہینہ بعد یہ قارئین تک پہنچیں گی۔ سجانے لکت پانی راوی اور چاب کے پکوں کے نیچے سے بہ چکا ہو گا۔ ممکن ہے کہ یہ تحریر محض ایک تاریخی ریکارڈ ہی بن جائے۔

کی جنگ کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا۔ خوشی خوشی سے ایک ایک کر کے شہید ہو رہے ہیں۔
 نمازیوں اور شہیدوں کی سعادت اپنی جگہ، مگر باقی تمام احوال کیا اس کا پتہ نہیں دیتے کہ سلطنتِ
 کائنات کا شہنشاہ حقیقی ہم سے خوش نہیں ہے۔ اس نے ہم پر بہت بہت کرم کیے، مگر ہم نے اس کے
 الطاف و احسانات سے بہرہ مند ہو کر اور زیادہ سرکشیاں کیں، ہم نے اپنے اندر جرائم اور گناہوں
 کو پالا، ہم نے ذرا سے فائدوں کے لیے کمزوروں کو ظلم کا نشانہ بنایا۔ حرام کمائیوں کو فروغ ہوا،
 حلال کا دائرہ سکڑا گیا۔ ہم نے تیز طرار اہل دولت و جاہ کی خوشامدی کیں اور اپنے ہاں کے
 شریف اور ایمانداروں اور دیانت پسندوں اور پاک نگاہوں کو اپنے اندازِ تحقیر سے منہیں لگائیں
 اور ان کو پیچھے دھکیلا، نیز شرافت کے ظلم کے ساتھ غریبی کے جرم کی سزا بھی دی۔ ہم نے دینِ
 اسلام کی وحدت و اخوت کو پارہ پارہ اور اس کے اساسی عقیدہ توحید کی بیخ کنی کے لیے علاقہ پرستی،
 لسان پرستی، نسل پرستی، صوبہ پرستی اور سیکولرازم اور سوشلزم کے رنگ برنگے جھنڈے اٹھا کر
 گروہ بخلاف گروہ مار دھاڑ شروع کر دی۔ ہماری تباہی کے لیے جو کام دشمنوں کو کرنا تھا اُسے
 ہم نے رضا کارانہ طور پر خود اپنے ہی ہاتھوں سے بعجبت مکمل کر دینے کے جتن کیے، تاکہ ہمارے
 دشمنوں کو تکلیف نہ ہو۔

اس وقت راوی کے سیلاب زدہ وسیع علاقے جیسے قریب ہونے اور ریڈیو اخبارات وغیرہ سے
 خبریں معلوم کرنے اور سیلاب زدوں کی خدمت کے کاموں پر نکلنے والے مجاہدینوں سے ربط کی وجہ سے
 حسبِ ذیل باتیں میرے نوٹس میں آتی ہیں۔

۱۔ مجموعی طور پر ہماری سرکاری مشینری اور ہماری خدمت کیش تنظیموں اور خاص خاص
 اداروں کے متعلق پول یہ کھلا کہ پوری طرح تباہی واقع ہونے سے پہلے کوئی کچھ نہ کر سکا۔ اور تندی سیلاب
 کے ابتدائی مرحلے میں بہت ہی کم اور بہت ہی سست رفتار سے مصیبت زدگان کو امداد دی
 جاسکتی تھی۔

۲۔ جو بھی اچھی خدمات ہوئیں مجھے ان کا دل سے اعتراف ہے اور خصوصاً فوجی جوانوں کی بے لوث جفا کارانہ
 خدمات کا بہت احترام کرتا ہوں۔

۲۔ امداد دینے والے جو نکلنا شروع ہوئے تو ان سے سوگنا تماشائیوں کے ٹھٹ، کچھ گاڑیوں میں، کچھ پیدل بہ طور پکنک جمع ہو گئے اور وہ کاموں میں اتنی رکاوٹ بنے کہ پولیس کو لاٹھی چارج بھی کرنا پڑا۔ مگر لاٹھی چارج سے کیا ہوتا ہے پنجابی مصرعہ ہے:

پیتروں کی پند نصیحت، مورا کھ توں کی پالا؟

۳۔ بات تماشائیوں تک رہتی تو خیر، ساتھ تماش بین بھی موجود! سیلاب زدہ علاقے سے جو لوگ آکر بیٹھتے ان میں کچھ لڑکیاں ہوتیں۔ جہاں کوئی مناسب عمر کی اچھی لڑکیاں نظر آئیں تو لاہور کے مہذب ثقافتی شہر کے گھبروان کی تاک جھانک میں لگ جاتے۔ اور وہ بیچاری جو پہلے ہی کوتاہ لباسی کی ماری ہوئی ہوتیں یوں محسوس کرتیں کہ بُری نظروں نے انہیں بالکل عریاں کر دیا ہے۔

۴۔ تماش بینی بھی ایک منزل ہے۔ اس سے آگے کا مقام عظیم ان لوگوں نے حاصل کیا جنہوں نے خالی گھروں (یا ایسے جہاں بے سہارا بچے تھے یا کوئی تنہا بڑھیا) سے مال و متاع کوٹنا شروع کر دیا اور خدمت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ بعض صورتوں میں بچیوں اور بچوں ہی کی دولت بیدار کو لے اُڑے۔ بلکہ عورتوں کو بھی۔

میں سوچتا ہوں کہ جس قوم نے ۱۹۴۷ء میں بڑے بڑوں کی دنیا کو گٹے دیکھا ہو، جس نے ۱۹۶۵ء میں بے شمار لہجیوں اور گھروں کی تباہی دیکھی ہو، جس نے ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) میں پاکستانیوں کو شہید اور پھر قیدی بننے اور مال و جائیداد سے محروم ہوتے دیکھا ہو اور جس قوم کی آنکھوں کے سامنے عبرت کے ٹیلی وژن پر اوجھڑی کیمپ کا سماں دکھا دیا گیا ہو، اس میں انسانوں کو بے وقعت اور مال و املاک کو گراں قدر قرار دینے والے کہاں سے آگئے۔

تمہارے سامنے موت کا رقص جاری ہے، کثیر التعداد جنازے اُٹھتے ہیں، ہسپتال لاشوں اور زخمیوں سے بھر گئے ہیں۔ گھر گھر سے یا تو چیخیں اور سسکیاں بلند ہو رہی ہیں، یا پتھرائی ہوئی آنکھوں اور جھیا تک سناٹے سے سابقہ ہے۔

پھر اگر تمہیں احساس نہیں ہوتا تو کیا تم درندے ہو؟

تم دنیا کے ان سراپوں اور نظر کے فریبوں پر لٹو ہوتے ہو، جو تمہارے سامنے چھایا بن جاتے ہیں۔

۵۔ میخانہ سیاست کے متوالے جنہوں نے قریب آمدہ انتخابات کے تازہ تازہ جام چڑھائے

ان میں سے اکثر محض اس لیے خدمت کے میدان میں آگئے ہیں کہ ان کا نام چھپ جلتے اور کمیوں کی تصویریں چھپ جلتے سے ووٹوں کی منڈی میں ساکھ بڑھ جائے گی۔ کچھ لوگ جو پہلے سے اس قسم کے کام کرتے رہے ہیں، بلکہ پاکستان کے روزِ اقل سے کرتے رہے ہیں۔ ان کا وجود نئے سیاسی خدمتگاروں کے انبوہ کثیر میں گم ہو گیا ہے۔

خدمت جب سیاست کے تابع ہو جائے تو اس کی یہ برکت نہیں ہوتی کہ دلوں میں خدا خوفی اور اس کے بندوں کے لیے سچی محبت و اخوت پیدا ہو۔

۶۔ تماشائیوں میں سے ایک خاص عنصر کا یہ کارنامہ بھی ریکارڈ پر رہنا چاہیے (اور اخبارات میں آچکا ہے) کہ شہر کے مخیر لوگ جو دیگیں بکوا کر سیلاب زدگان کے لیے بھیجتے ہیں، ان میں سے یہ عنصر زورِ زبردستی اپنا حصہ وصول کرتا ہے۔ پھر جو بیچ رہے وہ مصیبت کے ماروں کے لیے۔ گویا یہ لوگ گھنٹوں کا وقت تفریح میں گزارنے کے لیے سیلاب زدگان سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ یہ ایک نیا شگوفہ کھلا ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

۷۔ مجھے چند ایسی خواتین کا علم ہے جو خود بتا گئیں کہ جب جہاں سیلاب زدگان کے کھانے پینے کے لیے کچھ ٹٹا ہے تو ہماری بستی کے گھروں کے لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ برابر کا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اب اسی خبر کا پیمانہ ذرا بڑھا کر سوچ لیجیے۔

۸۔ خلا اور اس کے دین کو برطرف کر دینے کی وجہ سے ایک عذاب یہ وارد ہوا ہے کہ تفریحی اسکرین اور اسٹیج کے لوگ — ہیرا اور ہیر وئیں، اداکار اور اداکارائیں، ٹھکڑا کارا و گلوکارائیں ایکٹنگ کے اظہار کے ساتھ، نگاہوں کے غمزوں کے ساتھ اور جانِ موسیقی بننے والی آوازوں کے ساتھ لشکرِ در لشکرِ ٹرک لے کر ایک ایک بازار میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اور اب سیلاب زدہ علاقے میں بہ نفسِ نفیس مع اپنے شاندار لباسوں اور میک اپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔

یہ بھی ایک نیا تجربہ ہے جو مصیبت کے وقت سامنے آیا ہے۔ دراصل ایک بڑا تغیر جو معاشرے میں پچھلے چند برس میں ذرائعِ ابلاغ کے ذریعے آیا ہے وہ یہ ہے کہ اس خاص عنصر کو جو بالعموم کنارے رہتا تھا، اُسے اب اٹھا کر ہمارے سروں پر بٹھا دیا گیا ہے۔ ہر روز ان کی کئی کئی تصاویر کا چھپنا، ان کے مقولوں اور فقروں کو سرخیوں میں ڈھالنا، ان کے انٹرویو لے کر چھاپنا۔ ان کی ذاتی اور گھریلو

زندگی اور ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کے ارتقاء کا ایک ایک پہلو نمایاں کرنا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس ملک میں تین ہی طبقے رہ گئے ہیں۔ سرمایہ دار و جاگیردار۔۔۔ ویرانہ اور اسمبلی کے ممبران اور ایکڑ اور گلوکار وغیرہ۔

اور دلچسپ یہ رویہ کہ چور کو تو ال کوڑاٹنے لگے مطلب یہ کہ اس طبقے کی سیلابی اداکاری پر دوسروں کے لیے تو لوگوں کو ناروا ہے، البتہ یہ گروہ تنقید کرنے والوں کے منہ آ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم قص و نغمہ والے لوگ غمزدہ عوام میں خوشیاں بانٹ رہے ہیں۔ یہ خوشیاں بانٹنے کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ ایک بادہ فروش بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ میں خوشیاں بانٹ رہا ہوں، طوائفیں بھی اس دعوے کے ساتھ نکل کھڑی ہوں گی کہ ہم خوشیاں بانٹنے والا طائفہ ہیں، ہر سبوتے خلعے میں خوشیاں بٹ رہی ہیں۔ اور انہی خوشیوں کا سیلاب ہے جو معاشرے سے خدا خوفی، خشیت، احساسِ عبدیت اور انسانیت کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو ہالے کیا ہے۔ انبیاءِ خوشیوں کے چشمے جاری کرنے نہیں آتے رہے۔ وہ ایمان، ہدایت، عبادت، نیکی اور پابندیِ حدود کا درس دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہی راستہ انبیاء کے پیروؤں کا راستہ ہے۔ اور اس راستے پر چلنے والوں کو چاہیے بہت آلام و مصائب بھگتنے پڑیں، لیکن انہیں سکینت اور فلاح حاصل ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی متاعِ مطلوب سکینت و فلاح ہے، جو علامت ہوتی ہے قربِ الہی کی اور آخرت میں بخشش کی لیے

جدید ماحدانہ تہذیب کا کمال یہ ہے کہ خوشیوں کے پھولوں کی بارش کرتی رہتی ہے مگر ہر پھول کے نیچے

ملے آج کل اخبارات کی خبریں اور تردیدیں عجیب ہوتی ہیں۔ متذکرہ جملے اس رپورٹ کے تحت لکھے گئے جو جنگ ۳ اکتوبر میں ”کچلرل رپورٹر“ کے حوالے سے شائع ہو گئی، مگر ہم اکتوبر کو فلم انڈسٹری کے نمائندوں کا اپنا اخباری بیان شائع ہوا جس میں تردید کی گئی کہ ہم نے اس طرح کی باتیں نہیں کہیں اور نہ ایک سیاسی جماعت کی مخالفت کا ہے، نہ ہم شہرت چاہتے ہیں اور نہ ہمیں اخباری بیانیوں کی فرصت ہے۔ ہم صرف خدمت کا کام کر رہے ہیں۔ (خلاصہ) مگر کچلرل رپورٹر صاحب نے جو مواد ۳ اکتوبر کو لاکھوں افراد تک پہنچا دیا تھا، اس کی وہ خود بھی تردید کرتے۔

اضطراب کے کانٹے اور انجام بد کے افعی چھپے ہوتے ہیں۔ اور اس تمدن کے بوکھلے ہوئے انسان کا حال نار دیکھ لیجیے۔ بس اسے یہ فن سکھا دیا گیا ہے کہ جب آنسو بہت بہنے لگیں تو زور سے تہمتہ لگا دے۔

۹۔ عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ لوگ ذہنی طور پر بہت پرانگندہ ہیں، نہ جماعتوں میں حقیقی اجتماعیت ہے، نہ لیڈروں میں کوئی اعلیٰ فکر اور روشن کردار ہے۔ عام افراد بھی ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جہاں جاؤ دو آدمیوں میں سے ایک کہے گا فلاں شخص بُرا ہے، دوسرا کہے گا وہ تو بہت اچھا ہے۔ کہیں یہ بحث کہ فلاں پارٹی دوستی کے قابل ہے، جواب یہ کہ اس کے کرتوتوں کا ریکارڈ بڑا خراب ہے۔ کسی اخبار کے کالم میں یہ سیاسی نکتہ کہ عبوری دور کی وزارتیں ختم ہو جائیں تو جمہوریت پورا جلوہ دکھائے گی، کسی دوسری جانب یہ رائے کہ وزارتوں کے ختم ہونے سے نظامِ کاریں بڑا خلل واقع ہوگا۔ کسی محفل میں یہ قصہ درپیش کہ بار بار کے مارشل لانے قوم کو خستہ حال کر دیا ہے، مقابل فریق کہتا ہے کہ جمہوریت جب بھی نمودار ہوئی تو قوم پر کوئی بھاری و بال ٹوٹ پڑا۔ زبان کے معاملے میں، تعلیم کے معاملے میں جنگی فیسوں والے انگلش میڈیم اسکولوں کے متعلق، ٹیکسوں کے متعلق، گرانی کے بارے میں، ایڈ اور قرضوں کے موضوع پر، تحریکِ کاری کے سلسلے میں، جہاد افغانستان کے عنوان کے تحت — اور ہر چیز کے متعلق جا بجا بحثیں ہیں، بحثوں سے بڑھ کر سر پھٹول ہے، سر پھٹول سے آگے نکل کر کلاشنکوفوں کی آتش باری ہے۔ کوئی کسی کی دلیل نہیں سنتا، کوئی کسی سے معقول بات قبول نہیں کرتا۔ کوئی کسی کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے خندہ پیشانی اختیار نہیں کر سکتا۔ ہر شخص اور ہر گروہ اور ہر فرقہ اور ہر عالم اور ہر لیڈر اور ہر ایڈیٹر اپنی اپنی جگہ قطبِ صاحب کی لالچ ہے کہ زمیں جنب نہ جنبہ گل محمد۔ کوئی سوال ہی اٹھ نہیں کہ عمر و عمل کی کمی کے ساتھ انا کے قامت کا کیا تناسب ہے؟ کوئی قابلِ غور بات یہ نہیں کہ کوئی صاحب کس بنا پر کتنی اتھارٹی کے ساتھ کس کے سامنے پہلوان بنے لٹکا رہے ہیں؟ پورا معاشرہ ایک دن لٹک رہے ہیں، جس میں خیالات، عقیدے، رائیں چاروں طرف سے اُٹ اُٹ کر ٹکرا رہی ہیں۔ اور ہر شخص اس خیال میں ہے کہ سارا خلوص اور ساری صداقت اس کے نام الاٹ ہو گئی ہے اور اس کا کام دوسروں سے اپنی بات منوانا اور ٹھونسنا ہے۔ کسی سے سمجھنے کا کوئی معاملہ نہیں۔

اس صورتِ حالات نے آپس کی محبتیں فنا کر دی ہیں۔ اعتماد کے رشتے توڑ ڈالے ہیں، ہم دمی ہم قدمی اور ہم منزلی کے جذبے ملیا میٹ کر دیئے ہیں۔ کسی آدمی کے سامنے آتے ہی ایک خوف و اندیشہ

مسلط ہو جاتا ہے کہ میری آدمی نہ جانے کس بحث کا چھڑاؤب سے نکال لے گا۔ اب تو خدا کی باتیں، نیکی کی باتیں اور خدمتِ انسانیت کی باتیں کہتے ہوئے ڈراتا ہے کہ آیا متکلم اپنی عزت کو سنبھال سکے گا یا نہیں۔

کتنا بڑا عذاب ہے جس سے ہمارا کوئی متنفس محفوظ نہیں۔

۱۰۔ پھر غالب بحثیں اور مکالمے، دنیوی معاملات اور سیاست اور اسمبلیوں اور پارٹیوں اور حکومت اور لیڈروں کے متعلق، سندھ اور پنجاب کے متعلق، بہاریوں اور کالا باغ ڈیم کے متعلق، ایم کیو ایم اور سچھانوں کے متعلق، آمدنیوں اور اخراجات کے متعلق، تقریبوں اور تقریروں کے متعلق، پلاٹوں اور عمارتوں کے متعلق ہوتے ہیں۔ اس سطح سے اوپر کی چیزوں کو ہم موصول بھلا بیٹھے ہیں۔

مجھ سے بہت سے افراد کی ملاقاتیں اور آدھی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ مجھے صدمہ ہے کہ چند سال سے بہت کم ایسا ہوا کہ کوئی صاحبِ دین کی کوئی اصولی بات، قرآن کی کوئی آیت، حدیث کا کوئی مسئلہ سامنے لائے ہوں۔ بہت سی مجلسوں کو ان چیزوں سے خالی پایا۔ بہت سے جلسوں اور تقریروں میں یہ پاکیزہ عنصر نہ تھا۔ ان کے سوا بہت باتیں — باتیں ہی باتیں۔

ہم لوگوں نے پچھنے دس پندرہ سال میں ملک میں پھیلے ہوئے عوام کے پاس جا جا کر اور ملاقاتیں کر کے، چھ چھ ماہ صرف کر کے خدا کی باتیں اس طرح نہیں پہنچائیں کہ ان کے دلوں میں چراغ روشن ہو جاتے۔ آج حال یہ ہے کہ باہر کے لوگ تو الگ رہے، سیلاب کی زد میں آتے والے اور کلاشکوفوں کا ہدف بننے والے اور عبرت کے ان مناظر کو دیکھ کر بچنے والے اکثر لوگ خدا خوفی، توبہ و استغفار، انابت و عبادت، ذکر و دعا کی حیات افروز اور امید افزا نورانیتوں سے دور ہیں جس خدا کے ہاتھ میں حوادث کی ساری باگیں ہیں، اُس کی طرف توجہ کرنے والے بہت کم ہیں۔

اپنی جگہ یہ تباہی اور یہ مصیبت زیادہ بڑی ہے۔ بمقابلہ سیلاب اور کلاشکوفوں کے! اور اس کے چھا جانے کا باعث ہماری اور تمام دینی جماعتوں کی یہ کوتاہی ہے کہ انہوں نے بچے بچے تک بار بار پیار اور محبت سے خدا کا پیغام پہنچانے کی پوری کوشش نہیں کی۔ خصوصاً شور بنس کے بڑھنے کا یہ دور، ٹیلی ویژن اور وی سی آر کا یہ دور، ثقافت کی پریوں کے رقص و سرود کا یہ دور، معیارِ زندگی کو بڑھانے کے لیے دولت کی سڑک پر دنیا پرستی کی مجنونانہ مسابقت (RACE) کا یہ دور، شریعتِ شہمی

اور لادینیت پسندی کا یہ دور، سرخ و سفید سامراج کی طرف سے اسلامی عقاید و اقدار کی تباہی مچانے کا یہ دور۔ اس میں جس زور و شور سے ملت کے ایک ایک فرد اور آسمانِ پاکستان کے ایک ایک ستارے تک پہنچنے اور اس کو گلے سے لگا لینے اور اس کے سینے میں نور محمدی کی شعاعیں اُتار دینے اور ان شعاعوں سے دل و دماغ کے چراغ روشن کر دینے کی ضرورت تھی، افسوس کہ جن کی یہ ذمہ داری تھی وہ اسے پورا نہ کر سکے۔

کیا اب چند سال کی سر توڑ محنت سے اس کوتاہی کی تلافی کرنے پر ہم اور دوسرے محبانِ دین تیار ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے اجتماعی وجود کا انجام کیا ہوگا۔ بلکہ اگر جواب اثبات میں ہو تو بڑے سے بڑے بگاڑ کو خیر و فلاح سے بدلا جاسکتا ہے۔

سیلاب سے متعلق ایک مسئلہ خصوصی طور پر قابلِ غور ہے۔

ہمارے دریاؤں کا پانی بھارت نے خرید کر جب اُن پر ڈیم بنالیے اور ان کا بہاؤ اپنی زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے تبدیل کر لیا تو اب اسے اس اصولِ انصاف کو تسلیم کرنا چاہیے کہ جو جس چیز سے فائدہ اٹھائے، اس کا نقصان بھی وہی برداشت کرے۔ اگر یہ نقصان پاکستان کی سرزمین اور آبادی اور دولتِ وسائل کو پہنچے تو اس کا تادان اُسے ادا کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اس بار تو بھارت کی طرف سے پانی کی آمد، اس کے وقت اور اس کی مقدار کی ٹیسی کوئی مکمل اطلاع نہیں دی گئی۔ ازیں صورت اس کی ذمہ داری اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

لیکن بنیادی طور پر تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وہ سیلاب کا پانی جمع ہو جانے پر ہماری جانب کا کوئی بند نہ توڑے بلکہ اپنی ہی سرزمین پر اس کے بہاؤ کا انتظام کرے۔ اگر اُدھر سے کوئی کوتاہی ہو تو راوی اور ستلج پر ایسے پلے اور بند تعمیر کیے جائیں جو پانی کو پاکستان میں داخل ہونے سے روکیں۔ اس کا بہاؤ بھارت کی طرف موڑ دیں کسی معاہداتی طریق سے باطلے ہو سکے، یا اقوامِ متحدہ میں بحث اُٹھا کر کامیابی حاصل کی جاسکے۔ یا پھر عالمی عدالت میں یہ قضیہ حل کر لیا جائے۔

اگر یہ مسئلہ حل نہ ہو تو خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہوگی کہ بھارت کسی بھی موقع جارحیت پر دریاؤں کے بند اوپر سے کھول دے یا توڑ دے اور آدھا پنجاب، خصوصاً وسطی حصہ، زیرِ آب آجائے، تباہی اور محاصرے کی پریشانی اپنی جگہ، نقل و حرکت کرنا بھی ممکن نہ ہو، کہیں کیمپ نہ لگائے جاسکیں، موچے نہ بن سکیں، بجلی کے وسیع علاقہ محروم ہو جائے، پھر آخر دفاع کی ذمہ داریاں کیسے پوری کی جاسکیں گی۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اُدھر سے اچانک جارحانہ یلغار شروع ہو اور ادھر عین اس وقت جب کہ ہمارے عساکر سفر کر رہے ہوں اور توہین وغیرہ جگہ نصب ہوں، ایک ایک پانی کا لشکر بھی بھیج دیا جائے۔ اس صورت میں کیا سہ ہے؟

میرا خیال ہے کہ اعلیٰ ترین ذمہ داروں کو اس مسئلہ کے متعلق ”قولِ پُرس“ حد تک اطمینان بخش حل نکالنا اور عمل میں آنا چاہیے۔